مزاح کے چمن کا ایک اور پھول مرجھا گیا

تحریر: سہیل احمد لون

روتے آئے اور.....رلا کر چل دیئے

زندگی ہے بس.....رونے رلانے کا نام

اس رونے رلانے کی دنیا میں حقیقتاً ہنسنے ہنسانے والے لوگ بہت کم ہیں۔انسان کو خوش کرنا گویا کہ مشکل ترین کام ہے مگر کچھ لوگوں کو اللہ تعالی نے اس صفت سے نوازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک پل میں دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹ لا سکتے ہیں۔گزشتہ دنوں امان اللہ خان اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ان کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ ہر قسم کے انسان کو اپنے فن میں ایسا مسحور کرتے تھے کہ بندہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔یوں دیکھیں تو انسان کو خوش کرنا خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں ستر برس کی زندگی میں سے تقریباً چار دہائیاں پیشہ وارانہ زندگی میں اپنے اعمال نامے میں نیکیاں لکھواتا رہا۔انہوں نے سٹیج،فلم،ٹی وی میں اپنے فن کے جوہر دکھائے اور پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔انکے پرستار اور شاگرد پاکستان سمیت ہندوستان میں بھی ہیں، بھارتی کامیڈین کپل شرما اور چندن پربھاکر امان اللہ کو اپنا گرو مانتے ہیں۔اپنے کام میں اتنے جنونی تھے کہ لگاتار 860 دن رات سٹیج ڈرامے کر کے عالمی ریکارڈ بنایا۔وہ جتنا بڑا افتکار تھا اسی بلند پایہ کا انسان بھی تھا۔پاکستان کے پہلے سٹینڈ اپ کامیڈین امان اللہ خان سے میری دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔پہلی مرتبہ جولائی 1996ء میں جرمن ایمبیسی اسلام آباد ان سے ملنے کا موقع ملا۔سفید کرتے اور شلوار زیب تن کیے وہ اپنی فائل ویزے کے لیے جمع کروا کر ویٹنگ ہال میں بیٹھے تھے ان کے ساتھ سٹیج کے تین اور فنکار بھی تھے۔جرمنی میں وہ اپنی ٹیم کے ساتھ شو کرنا چاہتے تھے مگر سہ پہر کو جب ان کو پاسپورٹ واپس کیا گیا تو ان کو ویزہ دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔میرا پاسپورٹ ایمبیسی والوں نے رکھ لیا اور میزان بینک جا کر فیس جمع کروانے کا کہا۔میں اور امان اللہ خان (مرحوم) اکٹھے ہی ایمبیسی سے باہر نکلے باہر شدید گرمی تھی۔امان اللہ صاحب نے کہا کہ ہٹلر تو چلا گیا مگر اس کی سوچ ابھی تک جرمن قوم پر چھائی ہے۔اس وقت ڈپلومیٹک انکلیو میں پرائیویٹ گاڑیاں اور پبلک ٹرانسپورٹ چلتی تھی۔امان اللہ اور انکے ساتھیوں نے اپنی کار جرمن ایمبیسی کے باہر درخت کے نیچے پارک کی تھی۔ مجھے کہا کہ چلو تمھارا ویزا تو لگ رہا ہے اس کا جشن سب سے پہلے ہمارے ساتھ مناؤ۔یہ کہہ کر انہوں نے کار کی ڈگی کھولی تو اس میں ایک بڑا سا واٹر کولر پڑا تھا جس میں برف کے ٹکڑے اور سندھڑی آم بھرے تھے۔اس میں سے ایک آم نکال کر سب سے پہلے مجھے دیا اور کہا کہ اسے کھانا نہیں.....میں نے کہا تو پھر کیا کرنا ہے۔ انہوں نے اپنے لمبے بالوں کو مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر مسکرا کر کہا ''اینوں چوپنا ایں'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور آم نکال کر میرے سامنے آم سامنے چوسنا شروع کر دیا اس کے بعد دیگر ساتھوں نے بھی ملکر آم (کھائے) چوسے۔ مجھے بینک تک لفٹ دی،سفر کے دوران انہوں نے ہٹلر کے دیس والوں کو ایسی جگتیں ماریں کہ اگر وہ سن لیتے تو ویزے کیساتھ ریٹرن ٹکٹ بھی دے دیتے۔چند لمحوں کی رفاقت میں ایک بات تو سمجھ آ گئی کہ یہ بندہ کسی پریشانی پر اپ سیٹ ہونے کی بجائے ہنسی مذاق میں اڑا دیتا ہے اور انسان دوست بھی ہے

اور اتنا بڑا فنکار ہونے کے باوجود بہت عاجز ہے۔ دوسری مرتبہ ان سے ملاقات ایک نجی چینل میں آفتاب اقبال کے پروگرام ''خبرناک'' میں ہوئی۔ اس وقت تک امان اللہ کی صحت کافی گر چکی تھی اور شوگر کی وجہ سے انکو بار بار پیشاب کرنا پڑتا تھا۔ اس پروگرام میں بھی امان اللہ خان صاحب بریک کے دوران پیشاب کرنے گئے واپس آنے تک بریک ختم ہو چکی تھی اور پروگرام لائیو آن ایئر ہو چکا تھا، جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے جا رہے تھے تو پروگرام کے میزبان آفتاب اقبال نے ہٹلر سٹائل میں ان کی طرف دیکھا، بعد ازاں انکی اس بات پر تکرار بھی ہوئی، اسی وجہ سے امان اللہ بعد میں انکے پروگرام سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ مزاح کے چمن کا پھول مرجھا کر گر چکا ہے مگر اسکے فن کی مہک سدا محسوس کی جائے گی۔ المیہ یہ ہے کہ جب کوئی اچھا انسان اس دنیا سے جاتا ہے تو اس کا نعم البدل کئی دہائیوں تک نہیں ملتا جبکہ کوئی شیطان صفت اس دنیا سے جائے تو اس کا خلاء پر کرنے والے بلا تاخیر سینکڑوں آ جاتے ہیں۔ مزاح کے بے تاج بادشاہ منور ظریف، ننھا، لیاقت سولجر، ببو برال، مستانہ، معین اختر، لہری، کمال احمد رضوی، علی اعجاز ..... باری باری چلے گئے مگر ان کا خلاء آج تک پورا نہ ہو سکا اور اب لگتا یہی ہے کہ امان اللہ خان کا خلاء بھی کئی دہائیوں تک پورا نہ ہو پائے گا۔ ایسے بہت سے فنکار، کھلاڑی اور زندگی کے دوسرے شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے لوگ جو کبھی پاکستان کا نام روشن کرتے تھے حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر خستہ حالی، تنگ دستی اور بھوک افلاس کے شکنجے میں ایسا آئے کہ ان کو ایڑیاں رگڑ کر مرنے پر مجبور ہونا پڑا یا اس وقت بھی وہ غیرت کی بوسیدہ چادر اوڑھے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر اپنے آخری وقت کا اکیلے انتظار کر رہے ہیں۔ علی اعجاز زندگی کے آخری ایام ایک علیحدہ کمرے میں رہنے پر مجبور ہوئے اور انکے ساتھ گھر والوں نے ہی غیر انسانی سلوک کیا جس کا اظہار انہوں نے مرنے سے قبل ایک ٹی وی شو میں کیا تھا، اسی طرح لہری بھی زندگی کے آخری ایام بڑے کرب کے گزارے، جگ کو اپنی بے ساختہ باتوں سے ہنسانے والا مرنے سے قبل کئی ماہ تک ایک کمرے میں اعتکاف ستم ظریفی پر رہے۔ ویسے آج تک کبھی کسی سابقہ جرنیل، جوائنٹ سیکریٹری، سابقہ ایم این اے یا ایم پی اے کو ایسی حالی میں نہیں دیکھا گیا ..... اسکی کیا وجہ ہے؟ اس لیے فنکار وار زندگی کے دوسرے شعبہ جات کے لوگوں کو اس سے کوئی سبق سیکھنا چاہئے اور مستقبل کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل بنانا چاہئے کہ آئندہ کوئی فنکار یا کھلاڑی علاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایڑیاں رگڑ کر مرنے پر مجبور نہ ہو۔ ان سب کو ملکر کوئی ایسی انجمن بنائی چاہیئے جو مصیبت زدہ فنکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے، امان اللہ مرحوم نے زندگی کے آخری ایام میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ سب فنکار اکٹھے ہوں اور ایک ایسی انجمن بنائی جائے جو فنکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ برا وقت تو کسی پر بھی آ سکتا ہے اور کم از کم جو اچھے دنوں کے ساتھی ہوں وہ تو آگے بڑھ کر انکے دکھوں کا مداوہ کریں۔ ضرورت پڑنے پر باہر آئیں اور اسی عوام الناس میں جہاں یہ کبھی خوشیاں بانٹتے تھے، سے مدد کی درخواست کریں۔ تا کہ آئندہ کسی فنکار کا حال ببو برال، مستانے، لہری اور علی اعجاز جیسا نہ ہو۔ یہ فنکار اپنے فن کا وسیع خزانہ چھوڑ کر جاتے ہیں بدلے میں انکو اگر شایان شان طریقے سے دنیا سے رخصت کیا جائے تو انکی روح اور مداح دونوں کو سکون ملے گا۔ معین اختر کا جنازہ تو ایک ساتھی فنکار جنید جمشید مرحوم نے پڑھایا تھا مگر امان اللہ کی تدفین کے موقع پر بھی کچھ بدمزگی ہوئی جس سے اجتناب برتنا چاہیئے۔ فنکار تو قومی اثاثہ ہوتے ہیں جو دنیا کے کسی کونے میں بھی جائیں ملک کا نام روشن کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

13-03-2020